ایک آیت

نحوی اشکال

یسئلونك ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمٰی والمسٰکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیرٍ فانّ اللّٰہ بہ علیم۔

آپ سے لوگ پوچھتے ہیں، کہ خدا کی راہ میں کیا خرچ کریں، تو ان کو سمجھا دو کہ خیرات کے طور پر جو مال بھی خرچ کرو، تو وہ تمہارے ماں باپ کا حق ہے اور قریب کے رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا اور تم کوئی سی بھلائی بھی کرو گے تو اللہ اس کو جانتا ہے۔

علامہ نابجا محمد کی طرح دوسرے مترجمین نے بھی یہاں لفظ 'ماذا' کا ترجمہ کیا ہے "کیا"۔ یعنی سوال کی نوعیت ان کے نزدیک یہ ہے، کہ خدا کی راہ میں یا از راہ شفقت و محبت انھیں مستحقین پر کن کن چیزوں کو خرچ کرنا چاہیئے۔ جواب اس 'کیا' کے بالکل مطابق نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ وجوہ انفاق، یا مصارف انفاق کیا کیا ہیں۔ اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے کتب تفسیر میں یہ توجیہ اختیار کی گئی ہے، کہ قرآن حکیم نے یہ انداز بیان اسلئے روا رکھا ہے، تاکہ سوال کرنے والوں کو یہ بتایا جائے، کہ پوچھنے کی چیز یہ نہیں کہ کیا خرچ کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ کہاں خرچ کیا جائے، لہٰذا جواب اس اصل اور اہم سوال کے عین مطابق ہے ــــ

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن حکیم میں اس اسلوب و پیرایۂ اظہار کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں سوال کی سمتوں کو بدلا گیا ہے، اور جواب اس لحاظ سے نہیں دیا گیا کہ کیا پوچھا گیا ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے دیا گیا ہے، کہ کیا پوچھنا زیادہ اہم اور انسب ہے۔ کیونکہ قرآن کے فرائض میں جہاں یہ داخل ہے کہ وہ پیش آنے والے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دے، وہاں انسانی عقل و خرد کی تربیت بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن یہاں اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ لفظ 'ماذا' جس کا ترجمہ 'کیا' کیا جاتا ہے عربی ادبیات و محاورات میں 'کیسے' اور 'کیونکر' کے معنوں میں بھی اکثر آتا ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں، خود قرآن ہی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو جب ایک قتل کے سلسلہ میں گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے دریافت کیا:

ادع لنا ربك یبین لنا ما ھی! ان البقر تشابہ علینا۔

آپ اپنے پروردگار سے کہیئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو، کیونکہ گائے کے انتخاب میں ہم گھپلے میں پڑ گئے ہیں۔

یہاں جس لفظ کا ترجمہ 'کیسی' ہوا' کیا گیا ہے، وہ یہی لفظ 'ما' ہے جسے خواہ مخواہ 'کیوں' کے ساتھ مخصوص کر لیا گیا ہے۔

عام مترجمین اس غلط فہمی میں کہ لفظ 'ما' کا موضوع کسی شئے کی حقیقت کے بارہ میں سوال کرنا ہی ہے کیفیت کے بارہ میں نہیں، اسلئے مبتلا ہوئے کہ منطق میں 'ما' کا استعمال اسی انداز سے ہوتا ہے۔ اس میں کیفیت کی علامت تو 'کیف' یا 'انیٰ' ہے اور حقیقت و ماہیت کی علامت 'ما' یا 'ما ذا' ہے ـــــ ہمارے ہاں تمام علوم و فنون چونکہ یونانی عقلیات اور مصطلحات سے بُری طرح متاثر ہوئے ہیں، اس لئے نحو بھی اگر اسکی زد سے محفوظ نہیں رہ پائی تو کوئی تعجب نہیں۔ اس کی ترتیب و تدوین میں بھی یونانی طرز و فکر سے مدد لی گئی ہے۔ حالانکہ دونوں کا دائرہ بحث اور مزاج بالکل الگ الگ ہے ایک کا موضوع اگر معنی ہے تو دوسرے کا لفظ اور اس کا استعمال۔ ایک میں اگر تعلیل و استدلال کی باقاعدگیاں ملحوظ رکھی جاتی ہیں تو دوسرے کی بنیاد سراسر سماع پر ہے۔ چنانچہ یہ حد سے بڑھی ہوئی یونانیت ہی کا کرشمہ ہے کہ نحو کی کتابوں میں جہاں اس چیز پر بحث کی جاتی ہے، کہ فاعل مرفوع ہوتا ہے، وہاں اس کی توجیہ بھی بیان کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، کہ فاعل کے لئے رفع ہی کیوں موزوں ہے، نصب کیوں نہیں؟ اور پھر اس طرح کے سوالات پیدا کر کے جن کا کوئی تعلق لسانیات سے نہیں ہو سکتا، نحو کے ڈانڈے فلسفہ و مابعد الطبیعیات سے ملا دیئے جاتے ہیں ـــــ یہی سبب ہے کہ یہ فن بجائے اس کے کہ سہل اور آسان ہوتا اور خالص ادبی ذوق پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتا فضول اور بے کار منطق آرائی سے بے حد دشوار اور غیر مفید ہو گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قفال نے اس غلط فہمی کو بھانپ لیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں لفظ 'ما' کیفیت معلوم کرنے کی غرض سے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ کہا یہی جاتا ہے کہ لفظ 'ما' ماہیت و حقیقت کے لئے آتا ہے۔ کیونکہ اتنا تو ہر کوئی جانتا ہی ہے، کہ خرچ کرنے کی کیا کیا چیزیں ہیں۔ ان سے متعلق سوال کی کیا حاجت ہے۔ اصل سوال یا وجہ خلش یہ شئے ہے کہ ہماری مہربانیوں کا استحقاق کن کن لوگوں کو ہے؟ قفال کی اس وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

اس نحوی اشکال کے بعد آیئے اب اس معنوی اشکال پر غور کریں جو اس آیت میں پنہاں ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مال و دولت کی فراوانیوں میں والدین کا حصہ ہے، اولاد کا حصہ ہے اور یتامیٰ و مساکین وغیرہ کا حصہ ہے۔ اس سے مفہوم یہ متبادر ہوتا ہے کہ والدین، اولاد اور یتامیٰ ایک ہی درجہ کا استحقاق رکھتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک والدین اور اپنے جگر گوشوں کا تعلق ہے، انکی خدمت، دیکھ بھال اور ضروریات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور مساکین و یتامیٰ کی خدمت، ایسا فریضہ بہرحال نہیں، جن کا ہر ہر شخص مکلف ہو۔ کیونکہ انکو دینا اور ان پر خرچ کرنا مستحبات ـــ کے قبیل سے تو ہو سکتا ہے۔ فرائض کی صف میں اس کا آنا مشکل ہے۔

مقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق نفقۂ تطوع سے ہے یعنی اس نفقہ سے ہے جو فرض نہیں۔ یہ تفسیر صحیح ہے اور اس سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انفاق یا خرچ کی ایک صورت تو وہ ہے، کہ جس میں والدین اور

اولاد کے جملہ مصارف کی ذمہ داری ایک شخص پر عائد ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ یہ ان سب کی جائز اور مناسب حد تک ضروریات کا متکفل تو ہے، لیکن مال و دولت اللہ تعالیٰ نے اس کثرت سے دے رکھا ہے اور روپے پیسے کی ریل پیل کا یہ عالم ہے کہ یہ ان کی آسائش کے معیار کو اور بڑھا سکتا ہے، اور نسبتہً زیادہ بہتر اور زیادہ شاندار طریق سے ان کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر صورتِ حال ایسی ہو اور مال و دولت کی فراوانیوں کی یہ کیفیت ہو، تب اس کا پہلا استحقاق والدین اور اولاد ہی کو حاصل ہے انہی پر اس کو اپنی دولت اولاً صرف کرنا چاہیئے۔ اس سے اگر کچھ بچ رہے گا، تو حسب ترتیب و ضرورت اس کے دائرے، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں تک پھیلتے چلے جائیں گے۔

ایک حدیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ تمہارے جذبہ بخشش و انفاق کا پہلا مصرف یہ لوگ ہیں:

امك، واختك، واخاك، ثم ادناك ادناك

تمہاری ماں، بہن، بھائی اور ان کے بعد دوسرے اقرباء و اعزہ

قرآن حکیم کے سامنے دراصل دو جذبے ہیں اور وہ دونوں کو باہم متلازم سمجھتا ہے اور دونوں ہی کو پروان بھی چڑھانا چاہتا ہے۔ ایک جذبہ تو مطلقاً انفاق فی سبیل اللہ کا ہے یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر ہر شخص کچھ اپنی ذات اور اپنی ذاتی ضروریات کی سطح سے اونچا اٹھ کر یوں سوچے، کہ بنی نوع انسان میں کچھ اور لوگ بھی اس کی ہمدردیوں اور مہربانیوں کے مستحق ہیں۔ اور اس کے مال و دولت اور راحتوں اور آسائشوں میں غربا اور مساکین کا بھی ایک مقرر حصہ ہے۔ دوسرا جذبہ یہ ہے، کہ ہر ہر انسان انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں پہلے اپنے قریب ترین اور محسوس ترین حلقوں کا زیادہ خیال رکھے ـــــ ان دونوں جذبوں میں تلازم کی کیفیتوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس کے اس نازک پہلو کو نگاہ و بصر کے سامنے خصوصیت سے لایا جائے، کہ اگر اس کے دل میں اس ماں کے لئے جذبہ فرزندی متحرک نہیں ہوتا، جس نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر اسے پالا ہے، اور اس باپ کے لئے یہ اپنے دل میں کوئی ہمدردی نہیں محسوس نہیں کرتا جس کی بے پناہ شفقتوں نے اسے اس لائق ٹھہرایا ہے کہ زندگی کی کامرانیوں سے ہمکنار ہو سکے۔ اور ان بھائیوں کے لئے اس کے قلب میں تاثر و گداز نہیں ابھرتا۔ جو اس کا دست و بازو ہو سکتے ہیں، تو ایسے قسی القلب شخص کے پہلو میں نوع انسانیت کے لئے کیا ہمدردیاں ہو سکتی ہیں؟ اسی طرح اگر کوئی شخص، ایک غریب کو دیکھ کر تڑپ نہیں جاتا، یتیم کے نالوں سے اس کے دل پر چوٹ نہیں لگتی اور ایک محتاج و بے کس انسان کی حالت اس کو متاثر نہیں کر پاتی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں وہ شئے لطیف موجود نہیں ہے، جو منبع اخلاق ہے، لہٰذا یہ والدین اور اولاد کے حق میں بھی مہربان و فیاض ثابت نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں، انفاق کے ایک اور پہلو کو بیان کیا ہے، جس کے بغیر وہ عنداللہ مقبول ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ پہلو ہے اس اخلاص اور یہ شعور کا کہ ہر ہر بھلائی اور نیکی کے اسباب و عوامل پر اللہ تعالیٰ کی نظر ہے۔ اگر نیکی اس کی رضا جوئی کی خاطر ہے تب تو مقبول ہے اور قابلِ اجر و ثواب بھی ہے، اور اگر اس کے برعکس اس میں ریا اور دکھاوے کی ملاوٹ ہے، تب اس کی مقبولیت مشتبہ ہی نہیں بلکہ یہ کلیۃً رد کر دینے کے لائق ہے۔

اخلاص کو اسلام کیوں ضروری ٹھہراتا ہے، اور کیوں وہ ان تمام بھلائیوں اور نیکیوں کو کالعدم قرار دیتا ہے جن کی تہہ میں اللہ کی خوشنودی کارفرما نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے، کیونکہ عموماً نیکی سے متعلق سیدھا سا معیار اس کی افادیت و نفع رسانی ہی ہے جو سمجھ میں آسکتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے کسی عمل سے کوئی نہ کوئی انسانی ضرورت پوری ہوتی ہے اور کسی غریب کی احتیاج کسی حد تک رفع ہوتی ہے، تو اس کو نیکی یا خیر سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ قرآن کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس طرح کی نیکی صورتاً تو نیکی ہے حقیقتاً نیکی نہیں۔ کیونکہ وہ انفاق و ہمدردی کو صرف اخلاقی مسئلہ نہیں سمجھتا اور نہ اخلاق کی سطح پر اس کو حل کرنا مفید ہی خیال کرتا ہے، بلکہ اس کو ایک طرح کی عبادت قرار دیتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت کے لئے رضا جوئی و اخلاص شرط اوّل ہے۔

(محمد حنیف ندوی)

اِسلام کی بُنیادی حقیقتیں

(مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

قیمت دو روپے آٹھ آنے

قرآن اور علم جدید

(مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ (پاکستان)